

”دیکھ گلابو! تیرا کرم دین زمانے کی ہر دیوار گرا کر تجھ سے ملنے آگیا ہے۔“ وہ اپنی چھت پھلانگ کر اس کی چھت پر جاتے ہوئے ہیرو کے انداز میں بولا۔

”کسی کو اتنا انتظار نہیں کراتے یا! یہ شریفوں کا شیوہ نہیں ہے۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے کھیلتی ہوئی شمیم آرا بننے کی کوشش میں تھی۔

”پیار کرنے والوں کو اتنا انتظار تو کرنا پڑتا ہی ہے گلابو! اس کے آدھا کلو کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے گویا ہوا۔

”یہ دنیا کب محبت کرنے والوں کو ملنے دیتی ہے، ابھی بھی نانا جان کے ڈر سے کتنی مشکل سے آیا ہوں۔“

”یہی تو میں پوچھتی ہوں۔ آخر کب تک ہم یونہی راتوں کو چھپ کر ڈر ڈر کر ملتے رہیں گے۔ جو ان کڑی (لڑکی) کو تو لوگ یونہی بدنام کر دیا کرتے ہیں اور مجھے بدنامی سے بہت ڈر لگتا ہے یا۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر لبہ لیے سانس لیتے ہوئے خود کو مجبور روئے بس ظاہر کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

”تیرا بابو تجھے بدنام تھوڑی ہونے دے گا جلد ہی تجھے بیاہ کر اپنے سنگ لے جائے گا۔“ کرم دین عرف مشھواسے شوخی سے دیکھتے ہوئے یقین دلا رہا تھا۔

”ہائے اللہ!“ وہ اس کی شادی والی بات پر شرماتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے منہ چھپا گئی تھی۔

”کیا ہوا؟ کسی ڈڈو نے تو نہیں کاٹ لیا۔“ وہ اس کے یوں درد سے ”ہائے اللہ“ کہنے پر گھبرا کر آگے

چپاٹھ کی چاندنی پورے صحن کو روشن کیے ہوئے تھی اور وہ فرشی پٹکھا لگائے، صحن میں چارپائی پر لیٹا۔ سر تک چادر تانے بے اور نانا جان کے سونے کا انتظار کر رہا تھا۔ چند ہی منٹوں بعد اسے بے بے کے خطرناک قسم کے خزانوں کی آواز سنائی دی تھی جس کا مطلب تھا کہ کمری نیند میں جا چکی ہے۔

اس نے آہستہ سے اپنے منہ سے چادر ہٹائی اور اپنی چھوٹی چھری بن جیسی آنکھوں کو پراسرار سے انداز میں گھما کر اپنے دائیں بائیں بے خبر سوتے ہوئے نانا

نکاح و طلاق

جان اور بے بے کو دیکھا اور محتاط سے انداز میں چارپائی سے اٹھ کر چپل پہننے لگا۔

ایک بار پھر اس کی نظر ڈرتے ڈرتے نانا جان پر پہنچ گئی تھی جو ہاتھ گال کے نیچے رکھے، ٹانگیں سینے سے لگائے، خوشواب تھے۔ بے بے کا تو وہ دیکھے بغیر بھی بتا سکتا تھا کہ وہ گرمی کی وجہ سے قمیص پیٹ سے اوپر اٹھائے منہ کھولے سو رہی ہوگی۔

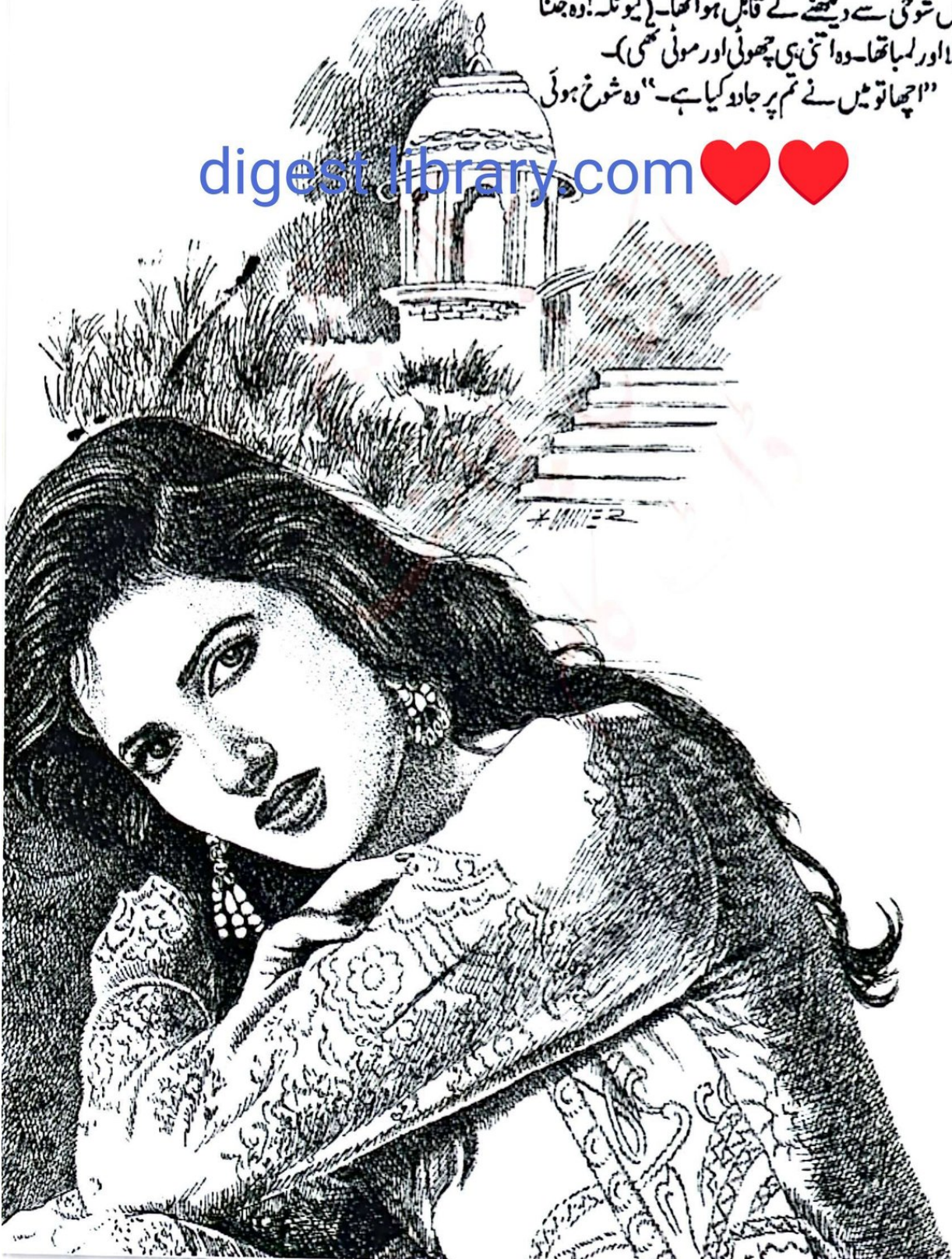
اپنی چارپائی پر تکیے کے اوپر چادر ڈال کر بہت دھیمے اور بے آواز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر چھت پر آگیا تھا۔

جہاں ساتھ والی چھت پر قدرے فریب جسم والی گلابو اپنے دوپٹے کا کونا ہاتھ پر لپیٹے ہیروئن بنی دائیں سے بائیں چکر لگاتے ہوئے یقیناً ”اس کا انتظار کر رہی تھی۔“

تھی۔ ”تو بتاؤ پھر تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟“ وہ
 شرماتے ہوئے اس سے محبت کا اظہار چاہتی تھی۔
 ”بے بے کہتی ہے کہ مجھے اپنی کھوتی سے بہت
 محبت ہے جو سارا دن اس کی سیوا کرتا رہتا ہوں، مگر
 اب تو تیری محبت میں اس سے بھی لمب نہیں دے
 پاتا۔ بے چاری مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگتی ہے۔
 اب خود ہی سوچ مٹھو کو اپنی کھوتی (گدھی) سے زیادہ
 تجھ سے پیارت ہے کہ نہیں جو کھوتی کو بھول کر سارا دن

بہتا۔
 ”تم لڑکے بھی بڑے بے شرم ہوتے ہو جی! بھلا
 یوں بھی کوئی کسی کنواری کڑی سے شادی کی بات کرتا
 ہے۔“ (گویا شادی کی بات صرف شادی شدہ لوگوں
 سے ہی کی جاتی ہے)
 ”کم تو تم کڑیاں بھی نہیں ہوتیں۔ بندے پر جانے
 کیسا جادو کر دیتی ہو کہ بندہ بے چارہ اپنا آپ ہی بھول
 جائے۔“ وہ قدرے جھکا تھا۔ تب کہیں اس کی آنکھوں
 میں شوخی سے دیکھنے کے قابل ہوا تھا۔ (کیونکہ! وہ جتنا
 دبلا اور لمبا تھا۔ وہ اتنی ہی چھوٹی اور موٹی تھی)۔
 ”اچھا تو میں نے تم پر جادو کیا ہے۔“ وہ شوخ ہوئی

digest library com





تیرے منہوں میں کھویا رہتا ہے۔“

اپنی سوچ کے مطابق وہ اسے بڑی مضبوط دلیل کے ساتھ اپنی محبت کا یقین دلارہا تھا اور گلابو کو کھوتی والی دلیل کچھ پسند تو نہیں آئی تھی مگر اس کی محبت اور بے تابی کا یقین ضرور آگیا تھا مگر اتنی آسانی سے وہ اس پر ناکر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے اس کی محبت پر پورا بھروسہ ہے تب ہی بولی۔

”چل جھوٹا!“ اس نے اپنی طرف سے ایک ادا سے اپنا نازک ہاتھ آہستہ سے اس کے کندھے پر مارا تھا جبکہ وہ اچانک ہونے والے حملے سے یوں اچھل کر زمین پر گر ا تھا جیسے تنکے کو ہوا اڑا کر دور پھینک دیتی ہے۔

”ارے!“ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے گرا دیکھ کر ہنسی

”کچھ کھاتا پیتا نہیں ہے کیا؟ جو میری محبت سے رکھا گیا ہاتھ بھی برداشت نہیں کر سکا۔“ وہ ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”مگر یہ پیار والا ہاتھ ایسے پڑا تھا تو جانے غصے میں بڑنے والا ہاتھ کیسا ہوتا ہو گا۔“ اس نے سوچا تھا اور اٹھنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر شرارت سے مسکراتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ کو ہلکے سے جھٹکا دیا تھا تاکہ فلمی انداز میں وہ اس پر آگرے۔ (یہ سوچے بغیر کہ اس بلڈوزر کے گرنے سے اس کی کسی ہڈی پسلی کے سلامت رہنے کی کوئی امید نہیں تھی)۔ گلابو کو تو اس جھٹکے سے ایک انچ بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ البتہ اس کے ہلکے سے جھٹکا دینے پر مٹھو صاحب اس کے اوپر گرتے گرتے بچے تھے۔ اسے زندگی میں پہلی بار اپنے دبلے پتلے ہونے پر افسوس ہوا تھا۔

”پنڈ کی میار سے اگر بیاہ کرنا ہے تو جان بنا۔ کچھ کھایا پیا کر۔ میرے سوہنے بابو۔“ وہ ہنستے ہوئے ایک ادا سے دوپٹا اس کی آنکھوں کے سامنے سے لہراتے ہوئے پلٹی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

وہ کہتے ہی پل پرانی فلموں کے ہیرو کی طرح بغیر

پاؤں جھپکاتے اسے دیکھ گیا تھا۔

گلابو سے پہلی ملاقات کی خوشی میں سرشار سا سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔ آخری زینے پر کھڑے ہو کر اس نے محتاط سی نظروں سے دائیں بائیں مشکوک انداز میں دیکھا اور یہ یقین کر کے کسی نے اسے چھت پر نہیں دیکھا جانے لگا تھا۔

”اوئی ماں!“ وہ سیڑھی سے ایک قدم ہی آگے بڑھا تھا جب کوئی بھاری چیز اس کے سر کے پچھلے حصے سے ٹکرائی تھی چاند تارے سارے سارے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اس سے پہلے چاند تاروں کو پکڑنے کی کوشش میں وہ زمین بوس ہوا۔ کسی نے اسے کالرسے پکڑ کر جھٹکا دے کر سیدھا کیا تھا۔

”ٹھہر ذرا میں تجھے چوری کرواتی ہوں چوری کرنے آیا تھا۔ وہ بھی صغریٰ کے گھر میں اب کرے گا چوری؟“

بے بے! اس کی گردن ٹانگوں میں دبائے مدھالی سے اس کی خوب دھلائی کر رہی تھی اور وہ سوائے ”او“ آ“ کرنے کے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر چلا بھی نہیں سکا تھا۔ ڈر جو تھا کہ بے بے اس کی آواز نہ پہچان لے۔ وہ تو بھلا ہو، بے بے کے گھٹنوں کا، جنہوں نے مزید بے بے کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا تھا (حالانکہ آدھا بے بے کا وزن تو اس کی بے چاری گردن نے اٹھا رکھا تھا) اس نے خود کو چھڑانے کے لیے ایک جھٹکا اور مارا تھا۔

”ہائے اللہ! میرے گوڈے (گھٹنے) گئے۔“ بے بے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی تھی اور وہ ان کی ٹانگوں کے ڈھیلا ہوتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا۔ اس نے اپنی چارپائی پر گر کر ہی سانس لیا تھا۔

”اے! اب کہاں چھپ گیا ہے۔ ذرا میرے سامنے آ“ تجھے چوری کرنے کا مزا چکھاؤں۔“ بے بے لالین لیے سارے گھر میں چور کو ڈھونڈ رہی تھی اور وہ بستر میں گھسا اپنے کراہتے وجود کو سہارا بنا تھا۔

”یہ تیرے چہرے کو کیا ہوا ہے مٹھو؟“ صبح نانا جان اس کے سوجے ہوئے چہرے اور گردن کو دیکھتے ہوئے زیران ہوئے تھے۔

”کچھ نہیں نانا جان! وہ رات جب دودھ لینے دکان پر گیا تھا۔ قصائیوں کے کٹر میں گر گیا تھا۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پہلے چھپانے کی کوشش کی تھی مگر نانا جان کی سخت گھوری نے اسے فوراً ہی کوئی سلی بخش جواب دینے پر آمادہ کر دیا تھا اور وہ بہانہ بنا گیا تھا کیونکہ اس کے سوال کوئی چارہ جو نہیں تھا۔

”نہ اتنا بڑا کٹر تجھے نظر نہیں آیا۔“ نانا جان نے اسے گھورا تھا۔

”ٹھیک کہتے ہیں بے بندے کی عقل گھٹیوں میں ہوتی ہے۔ تیری تو لگتا ہے گھٹیوں (نخنوں) میں بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں جب اللہ عقل بانٹ رہا تھا تو کہاں دفع ہو گیا تھا جو تیرے حصے میں کچھ نہیں آیا۔“ نانا جان لگی لٹی کے بغیر اس کی لاپرواہی پر اسے کھری کھری سنا کر چلے گئے تھے اور وہ منہ بناتے ہوئے ان کی بے وجہ (اس کے خیال میں) کی ڈانٹ پر کچھ بڑبڑا بھی نہیں سکا تھا۔ جانتا جو تھا کہ نانا جان کے کان اتنے تیز ہیں کہ اگر اس کی بڑبڑا ہٹ ان کے کانوں تک پہنچ گئی تو اس کی خیر نہیں ہے۔

بے بے (ثانی) ہر آنے جانے والے کو رات چور کی پٹائی والا اپنی ہمدردی کا قصہ بڑے فخر سے سنا کر داد وصول کرتے ہوئے حیران ہوتی رہی تھی کہ ایک لمحے میں چور غائب کہاں ہو گیا تھا۔

وہ جس نے بے بے کی بار پر طبیعت کی خرابی کا کہتے ہوئے ریڑھی نہیں لگائی تھی وہ بے بے کے خُرو خوشی سے متمتع چہرے کو دیکھتے ہوئے دانت پیتا رہا تھا۔



اس نے بے بے کی مار کھانے کے بعد رات بہت پر جا کر گلابو سے ملنے سے ہی توبہ کر لی تھی اور اب سیب لو کیلے لو! مرد لو کی زوردار آوازیں لگتا ہوا تھا ہر گلی گلی گھوم کر پھل بیچ رہا تھا مگر اس کا ذہن اس

سوچ میں الجھا ہوا تھا کہ گلابو سے کیسے ملاقات کی جائے جس میں بے بے یا نانا جان کی مار کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر اسے خط لکھنے کا خیال آیا تھا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے چٹکی بجا کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ ”پوری ملاقات نہیں تو ادھی ہی سہی۔“ وہ خط لکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے گردن اڑائے اپنے آئیڈیل پر مسکرایا تھا۔

اس نے سن رکھا تھا کہ محبوب کو لوگ اپنے خون سے خط لکھ کر بھیجا کرتے تھے مگر اس کے اپنے دبلے پتلے وجود میں تو پین بھرنے جتنا بھی خون نہیں تھا۔

”اب خط لکھنے کے لیے خون کہاں سے لاؤں۔“ وہ گال کے نیچے ہاتھ رکھے سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

”قصائی۔“ کتنی دیر سوچوں میں الجھے رہنے کے بعد اسے قصائی کا خیال آیا تھا اور وہ وقت ضائع کیے بغیر فوراً ”قصائی سے بکرے کے خون کے ٹوکڑے مل بھر کر لے آیا تھا۔“

”گلابو کو کیا پتا چلے گا کہ یہ میرا خون ہے یا بکرے کا۔“ اس نے سوچا تھا اور بے بے کے کسی بڑوسن گے گھر اور نانا جان کے مسجد میں چلے جانے کا یقین کر کے چھت پر چلا آیا تھا۔

”کیا لکھوں۔“ وہ پیر اور قلم کے طور پر جھاڑو کی تیلی لیے بیٹھا لفظوں کو ترتیب دینے لگا تھا۔

”میری پیاری لال گلابو! بے بے کا مٹھو تیرا بابو تمہیں سلام پیش کرتا ہے۔ بے بے کی اس دن والی مار میں اور میرے فرشتے ابھی تک نہیں بھولے اس لیے ملنے آنے سے قاصر ہوں، لیکن تجھ سے ”لوپو“ بہت کرتا ہوں۔ امید ہے تم بھی مجھ سے لوپو کرتی ہو۔“

اس نے خط لکھ کر ایک نظرات سے دیکھا تھا اور مطمئن ہوتے ہوئے جیب میں ڈالنے لگا تھا جب کسی خیال کے تحت اس کی جیب میں جاتے اس کے ہاتھ رک سے گئے تھے۔

”ارے۔“ شعر تو میں نے کوئی لکھا ہی نہیں۔ گلابو

شارپ میں دو نمبر گوشت ڈال دیتا تھا۔ ہڈیوں اور زیادہ چربی والا۔

”جا جلدی اسے بوتل دے کر آ۔ پھر ریڑھی بھی لگانی ہے۔“ بے بے کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی اور وہ سر ہلاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا پہلے اس نے بے بے کی نظر بچا کر بوتل موٹر کے پیچھے چھپا دی تھی پھر باہر نکل گیا۔

گلابو کی دس گیارہ سال کی بہن گلی میں ہی کھیل رہی تھی اس نے اسے دس کے نوٹ کالا بچ دے کر خط گلابو تک پہنچایا دیا تھا۔



کرم دین عرف مٹھو! جو اپنے آٹھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا جب ساتویں میں اپنا ریکارڈ قائم رکھتے ہوئے مسلسل دوسری بار فیل ہوا تو اس کے ”اب کبھی فیل نہیں ہوں گا ابا“ کے وعدے میں آجانے والا ابا اس بار اس کے کسی وعدے میں نہیں آیا تھا اور اس نے لاتوں گھونسو سے اس کی وہ خبر لی تھی کہ وہ یادگار دن مٹھو آج تک نہیں بھولا تھا۔ وہ تو بھلا ہو، بے بے کا جو اس دن ان کے ہاں ملنے گئی ہوئی تھی۔ اس سے اپنے لاڈلے، پتلی پتنگ مٹھو کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک کچھ پسند نہیں آیا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ پنڈ لے آئی تھی۔

اس کے امی، ابا نے اس سیدھے سادے باولے اور کسی حد تک بے وقوف مٹھو کے پنڈ سدا ہارنے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ جانتے جوتھے کہ نانا جان کی سختی اسے بندے کا پتر ضرور بنا دے گی اور خود اس نے تو اس جیل خانے سے رہائی ملنے پر بھنگڑے ڈالے تھے جہاں ایک کمرے پر مشتمل فلیٹ میں ان دس افراد کا رہنا ایسے ہی تھا جیسے مرغیوں کے ڈربے میں رہنا۔ گرمیوں میں تو پھر بھی گزارا ہو ہی جاتا تھا، مگر سردیوں میں سونے کے لیے انہیں چارپائی کے اوپر چارپائی رکھ کر اسے دو منزلہ عمارت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ دو بھائی نیچے والی چارپائی پر سوتے اور دو اوپر والی پر۔ اسی طرح

لیا سوچے کی کہ اس کے حسن کی تعریف میں میں نے ایک شعر بھی نہیں لکھا۔“ خود کلامی کے انداز میں بولتے ہوئے وہ دوبارہ لکھنے کے لیے پیپر کھول کر بیٹھ گیا تھا، مگر شعر اسے تو کیا اس کے پورے خاندان میں دور دور تک کسی کو نہیں آتا تھا۔ مگر

”شعر لکھنا بے حد ضروری ہے۔“ اس نے سوچا اور لفظوں کے پیچھے بھاگ دوڑ کر بے شک وہ خود ہانپ گیا تھا، مگر کچھ لکھنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

چہرہ چاند، آنکھیں ستارے

چھینی ناک گال غبارے

”جی او مٹھو! تو تو شاعر بن گیا ہے۔“ اس نے شعر لکھ کر اپنے کندھے کو پتلی دیتے ہوئے گردن کو اکڑائے دائیں بائیں دائیں والی نظروں سے اپنے آگے جمع فرضی مجمع کو دیکھا۔ اپنے تئیں وہ ایک شعر لکھ کر خود کو بڑا معتبر سا شاعر سمجھ لیا تھا۔ شعر گلابو کو ذہن میں رکھ کر دناٹھا گیا تھا۔

”ہاں! آپ ٹھیک ہے۔“ اس نے ایک نظر پورے خط پر ڈال کر مطمئن اور خوش ہوتے ہوئے خط چوم کر جیب میں ڈال لیا تھا۔

بڑی محتاط نظروں سے وہ میڑھیاں اتر رہا تھا جب باہر سے آئی بے بے اس کے ہاتھ میں لال بوتل پکڑے دیکھ کر خشک کر رک گئی تھی۔

”یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے مٹھو۔“ وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی بوتل کو بغور دیکھتے ہوئے موٹے عدسوں والی عینک کو انگلی سے ناک پر رکھتے ہوئے مشکوک ہوئی۔

”کچھ نہیں بے بے، قصائی کی ہے۔ اس نے جھاڑیوں والے بابے سے دم کروانے کے لیے دی تھی کہہ رہا تھا کہ اس کی دکان پر کسی نے کچھ کر دیا ہے۔“

وہ معصوم سا بنا کن انکھیوں سے بے بے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”گوشت کی بجائے۔ جب ہڈیاں اور چربی لوگوں کو نیچے گا تو گاہک کیا خاک اس کے پاس جائیں گے۔“ بے بے اس قصائی کی بے ایمانی پر ہمیشہ اس سے نالاں رہتی تھی جو پیسے ایک نمبر گوشت کے لے کر نظر بچا کر

ہمارے ہمیشہ سوئیں تھیں کہ امی، ابا کو بھی اسی طرح نہایت۔ ابا بے چارہ آدھی رات تک اپنی چارپائی سے نہ گھومتے تھے اس کی ماں کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے، ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گنگنا تارتا۔
”چن کتھاں گزار سی امی رات دے“

اور وہ سب کمر میں منہ دیائے ابا کی بے قراری سہارا دے رہے۔ بے بے کا گھر تو بہت کھلا اور ہوادار تھا اور اس میں اپنی چارپائیاں کہ وہ کبھی ایک پر اور کبھی دوسری پر اچھلتا رہتا۔ پوری چارپائی پر کھڑے ہو کر بدل کر سونے کا جو مزہ ہے وہ اسے بے بے کے ہاں آکر ہی محسوس ہوا تھا ورنہ شہر میں تو اکثر ہی جب اس کا بھائی کھڑے لیتا تو دھڑلہ مٹھا اس کے جھٹکنے سے زمین ہل جاتا۔

بظاہر تو بے کی نرمی اور محبت میں سب ٹھیک تھا، مگر نانا کی سخت اور اصول پسند طبیعت ابا سے لم نہیں۔ کچھ زیادہ ہی لگی تھی اسے۔ اوپر سے اس کے مزید پڑھنے سے انکار پر انہوں نے اسے مسجد میں قرآن حفظ کرنے پر لگا دیا تھا اور ساتھ ہی اسے گدھا گاڑی لے دی تھی کہ وہ پھل بیچ کر اپنے باپ کا ہاتھ بنائے۔ ریڑھی لگانے پر تو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر اس جیسے کوڑھ مغز کے لیے قرآن زبانی یاد کرنا بے حد مشکل تھا۔ مگر نانا جان کو انکار کرنے کی ہمت بھلا اس میں کہاں تھی۔ تب ہی وہ جیسے تیسے مسجد جانے لگا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا۔ مسجد کے امام کا جس نے خود ہی نانا جان سے کہہ دیا تھا کہ۔

”میاں جی! ایک سال میں آپ کا مٹھو صرف آدھا سفعہ یاد کرنے کے قابل ہوا ہے اور وہ بھی انک انک لڑکھائیاں نہیں خیال کہ وہ اس جہنم میں پورا قرآن حفظ کر پائے گا۔“

مجبوراً نانا جان کو اسے مسجد سے ہٹانا ہی پڑا تھا، مگر وہ پانچ نمازیں اسے ضرور پڑھاتے تھے۔ سردی گرمی میں اسے نماز چھوڑنے کی کوئی رعایت نہیں تھی اس سے پہلے کہ وہ نانا جان کے ناروا سلوک (اس کے ذاتی

خیال میں) سے بددل ہو کر بھاگ ہی جاتا اگر اس کی پردوں گلابو کی محبت اسے اپنی نرم آغوش میں جکڑ کر بھاگنے کے تمام راستے بند نہ کر دیتی۔

ہوا کچھ یوں کہ گلاب نورین عرف گلابو اس کی ریڑھی سے پھل لینے آئی تھی۔ وہ اس سے پھلوں کی قیمت پوچھ رہی تھی اور وہ اس کے گول مول، گھٹے جیسے وجود اور نمائندگی جیسے گلابی پتھرے میں کھویا کسی اور ہی جہاں میں پہنچا ہوا تھا اور وہ اسے کھویا ہوا دیکھ کر اپنی مرضی کا پھل لے کر پیسے دیے بغیر شرماتی۔ لجائی چل پڑی تھی۔

گلابو کو واپس جاتا دیکھ کر اس کا طلسم ٹوٹا تھا اور وہ ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہی اس کے پیچھے لپکا۔
”حضور! آپ میری ریڑھی سے پھل لے آئی ہیں، مگر پیسے نہیں دیے۔“ پشت پر ہاتھ باندھے بھنوس اچکاتے ہوئے وہ قدرے جھجھک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ صرف پرانی فلموں کو پسند ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اکثر ہی وہ خود کو انہیں فلموں کا کوئی کردار تصور کرتا تھا جیسے کہ اب خود کو محمد علی سمجھ رہا تھا۔ گلابو تو شاید اس سے بھی زیادہ پرانی فلموں کی دیوالی تھی۔ تب ہی تو اس کے پوچھنے پر پلوں کو اٹھاتے گراتے ہوئے شرمائی سی گویا ہوئی تھی۔

”آپ نے تو ہمارا دل چر لیا ہے بابو! ہم نے تو آپ سے پیسے نہیں مانگے۔“

ہونٹ کا کونا دانت تلے دباتے ہوئے لمبے لمبے دے کے مریضوں کی طرح سانس لیتے ہوئے اسے کسی طور زیبا سے کم نہیں لگی تھی۔ شاید اس کے شہر سے آنے کی وجہ سے وہ اسے بابو کہہ رہی تھی اور وہ تو اس کے منہ سے دل چرانے والی بات سن کر خوشی سے جھوم ہی اٹھا تھا۔ کتنے ہی بل وہ بے خود سے کھوئے ہوئے ایک دوسرے کو میٹھی نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔

”بابو! پھر ملیں گے۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے ایک ادا سے جانے کے لیے مڑی تھی۔

اور وہ جو ہاتھ ہلاتے ہوئے بے خود سا اس کے پیچھے



”کیا تھا۔“

”یہ کیا ہو رہا ہے گڈی!“ وہ اپنی ہن جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکالتے ہوئے قدرے غصے سے اونچا بولا تھا۔

”نظر نہیں آتا سمو سے کھار ہے ہیں۔“ وہ اس کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

”یہ سمو سے میں نے تجھے گلابو کو دینے کے لیے کہا تھا۔ اس فوج کو کھلانے کے لیے نہیں۔“ اس نے ماتھے پر تیوری چڑھائے دو ٹوک انداز میں اسے جتاتے ہوئے اس کے بہن بھائیوں کی طرف اشارہ کیا جو کچھپ میں ہاتھ منہ خراب کیے کھانے میں مصروف تھے۔

”جانتی ہوں۔ تم نے یہ سمو سے باجی گلابو کے لیے بھیجے تھے، مگر وہ تو اپنی سہیلی کے گھر میلاد پر گئی ہوئی ہے۔ اب اگر کسی اور کو دیتی تو تو اور باجی گلابو پکڑے نہ جاتے۔“ وہ اسے تفصیل سے خود سمو سے کھانے کی وجہ بتا رہی تھی۔

”واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر گڈی سمو سے کسی اور کو دے دیتی تو اور نانا جان کو پتا چل جاتا کہ میں گلابو کو سمو سے بھیجتا ہوں تو وہ تو میری چمڑی اوھیز کر رکھ دیتے۔“ اس نے گڈی کی سمجھ داری پر سوچا تھا اسی لمحے نانا جان گلی کے کٹڑے سے برآمد ہوئے تھے اور مٹھو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ گڈی اس کے ڈرنے پر ہنس دی تھی۔

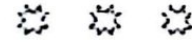
”یہ خط گلابو باجی نے تمہارے لیے بھیجا ہے اگر لینا ہے تو دس کانٹ میرے حوالے کرو۔“ وہ خط اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے ڈیل کرنے والے انداز میں بولی۔

وہ جو اس کے ہاتھ میں گلابو کا خط دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ اس کے پیسوں والی بات پر ماتھے پر پل ڈالتے ہوئے گھور کر گویا ہوا تھا۔

”کیوں؟ کس خوشی میں۔۔۔؟“

”اس لیے کہ میں آپ کے بھیجے ہوئے خط کا جواب لائی ہوں اتنا حق تو بنتا ہے نا میرا ٹائیوں سے منہ ہی میٹھا

ہائے لگا تھا۔ اس کے ایک دم سے دروازہ بند کر لینے پر اب پتا نہیں اس کا سردروازے پر لگا تھا یا دروازہ اس کے سر پر لگا تھا۔ نتیجہ تھے ہی پل وہ گول گول دائرے کی صورت گھومتا رہا تھا۔ پتا نہیں خوشی سے یا پھر سر پر لگنے والی چوٹ سے۔



”گڈی! دیکھ یہ سمو سے جا کر اپنی باجی کو ہی دیتا۔ ورنہ میں آئندہ سے تجھے ٹافیاں ہرگز نہیں لے کر دوں گا۔“ وہ گرم سموں والا اشارہ گڈی کے حوالے کرتے ہوئے اسے تنبیہ کرنا اور دھمکی دینا نہیں بھولا تھا۔

”کون سی باجی کو وڈی باجی کو یا چھوٹی باجی کو، میری تو بہت ساری باجیاں ہے کہو تو کتنی کر کے بتاؤں۔“ وہ پرافٹ میں ملنے والی چاکلیٹ کا سپر اتار کر کھاتے ہوئے تفصیل سے اسے بتانے لگی۔

”وڈی باجی کو۔“ اس نے جلدی سے وڈی پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ کہیں گڈی اسے اپنے گیارہ بہن بھائیوں کے نام ہی گوانا نہ شروع کر دیے۔

”یعنی گلابو باجی کو۔“ اس نے پر سوچ نظروں سے مٹھو کو دیکھا تھا اور اس کے زور زور سے اشیا میں سر ہلانے پر وہ اپنے دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد مٹھو نے دائیں بائیں مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ یقین کر کے کہ اسے کسی نے گڈی کو سمو سے دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اپنے گھر کی طرف دوڑ لگادی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے گدھے کو چارہ ڈالنے کے لیے باہر آیا تھا جب اس کی نظر غیر ارادی طور پر گلابو کے گھر کی طرف اٹھی۔

”یہ کیا ماجرہ ہے۔“ اس کے بیڑمانے کی وجہ گڈی کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سمو تھا۔ وہ حیران و پریشان سا ہوتا ہوا تیزی سے اس کے قریب گیا تھا جو اپنے سے چھوٹے چاروں بہن بھائیوں کو لیے بیٹھی مزے سے سمو سے کھا رہی تھی۔ اپنی حق و حلال کی کمائی محبوب کی بجائے غیروں کو کھاتا دیکھ کر اس کا خون ہی تو کھول

”اے! آنکھوں میں چالاک کی اور چہرے پر معصومیت لہو نہ سو کو دیکھ رہی تھی۔“

”نن خط بھیجنے کے لیے روپے بھی مجھے دینے ہوں اور خط وصول کرنے کے لیے بھی مجھے ہی پیسے دینے ہوں گے۔“ وہ بھنوس اچکاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”بے گلابو باجی پیسے نہیں دیں گی تو تمہیں تو دینے ہوں گے۔“ وہ کندھے اچکا کر کہتے ہوئے اسے کسی ہالالہ اوٹری سے بھی زیادہ ہوشیار لگی تھی۔

”پیسے دینے ہیں تو دو۔ ورنہ میں جاؤں۔ مجھے ابھی سے منڈوں کے بھی خط کڑیوں (لڑکیوں) کے گھر دینے جانا ہے۔ بڑے پیسے ملتے ہیں اس کام میں۔“ وہ اسے سوچتا دیکھ کر بے زار سی شکل بنا کر اپنی مسروریت کا بتاتے ہوئے آخر میں بڑی خوشی سے بولی۔

”اگر پیسے نہ دوں تو کیا تم یہ خط مجھے نہیں دوگی اور واپس لے جاؤ گی۔“ وہ اسے مزید پیسے دینے سے کتر رہا تھا۔ ابھی اسے اس پر اپنے ستر روپے کے سموے لمانے کا غصہ تھا۔ وہ اس سے ہی ستر روپے وصول کرنے کے چکر میں تھا۔

”واپس کیوں لے کر جاؤں گی۔“

”نن سو اس کے جواب پر خوش ہوا تھا۔“

”میاں جی کو دوں گی۔ پھر میاں جی جانیں یا تم۔“

وہ اندھے اچکاتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولی۔

ننانا جان کو بتانے والی بات پر اسے اچھو لگتے لگتے بچا تھا۔ وہ اس کی سوچ سے کہیں زیادہ چالاک تھی۔

”یہ ہی تو اسے نانا جان کو بتا دینے کی دھمکی دے رہی تھی۔“

کر رہا تھا کہ اس مکار گڈی کی گردن ہی مروڑ دے۔

”آئندہ سے اگر مجھے تنگ کیا تو سیدھا میاں جی (نانا) کو بتاؤں گی جا کر۔“ وہ دس کانٹ مٹھی میں دباتے ہوئے منہ بنا کر دھمکی دیتے ہوئے پلٹ گئی تھی۔

”ایک بار میری شادی ہو جائے گلابو سے پھر اگر میں نے تجھے اس گھر میں بھی گھسنے دیا تو پھر کہنا۔“ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کڑے تیروں سے اسے گھورا تھا۔

بے بے شاید پھر کسی کے گھر گئی ہوئی تھی اور نانا جان یقیناً ”مسجد میں گئے ہوئے تھے کیونکہ اسکول سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کا زیادہ تر وقت مسجد میں ہی اللہ کو یاد کرتے ہوئے گزرتا تھا۔



میرے بابو! السلام علیکم!

تیری گلابو کو تیرا خط مل گیا ہے مجھے بہت دکھ ہوا کہ بے بے نے تجھے چور سمجھ کر مارا۔ یقین کرو۔ تیری گلابو تیرے ساتھ ہونے والے ظلم پر اتنا روئی کہ اس کے آنسوؤں سے بالٹی بھر گئی رو رو کر اتنا کمزور ہو گئی ہوں کہ ڈاکٹر نے سیب اور مالٹے کھانے کے لیے کہا ہے۔ اچھا خدا حافظ! میں انتظار کروں گی۔ (تیرا نہیں مالٹوں کا)۔“

خط پر جگہ جگہ دھبے لگے ہوئے تھے یقیناً ”یہ گلابو کے انمول آنسو تھے وہ خط پڑھ کر افسردہ سا ہو گیا تھا کہ گلابو اس کو پڑنے والی مار سے روتی رہی ہے۔“

اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک اور خط گلابو کو لکھ کر بھیجے گا اور اسے بتائے گا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ رو کر اپنی طبیعت خراب نہ کرے۔



وہ روز، روز گڈی کو پیسے دے کر تنگ آ گیا تھا اب تو اس کے ساتھ ساتھ اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی دو دو روپے دینے پڑتے تھے کیونکہ یہ گڈی صاحبہ کا حکم تھا کہ اگر اس نے اس کے ساتھ اس کے بہن بھائیوں کو پیسے نہیں دیے تو وہ اس کا گلابو باجی کے



اس نے خالہ کو مٹھیں اٹھا کر اندر جانے دیکھ کر ہلکا سا نعروں لگا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا کہ وہ گڈی کو پیسے دینے سے بچ گیا اسے گڈی اور اس کی فوج سے چڑسی ہوئی جا رہی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب وہ خط گلابو تک پہنچا سکتا تھا جو اس پر نظر پڑتے ہی خالہ سے نظر بچا کر اسے واپس جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا سمجھا تھا جو آنکھوں میں شوخی لیے جلدی جلدی چھت سے ایک درمیانے سائز کا پتھر اٹھا کر خط لپیٹ رہا تھا خط لپیٹ کر ایک نظر صحن میں بیٹھی گلابو کو دیکھا اور خط اس کی طرف اچھال دیا۔

”اولیٰ ماں! میں مر گئی۔“ خالہ ہینو اچانک ناجانے کہاں سے صحن میں آگئی تھی پتھر میں لپیٹا خط عین اس کے سر پر لگا تھا اور وہ چلاتے ہوئے پلٹی تھی۔

”مٹھو تو تو کیا کام ہے۔“ اس سے پہلے کہ خالہ کی نظر اس پر پڑتی وہ رونی صورت بنا کر کہتے ہوئے دھم سے چھت پر گر کر جیت لیٹا اپنی سانس کو معمول پر لانے کے لیے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ خالہ ہینو کی گالیوں اور کونے کی آواز سے بخوبی آ رہی تھی مگر وہ کانوں میں انگلیاں ڈالے لیٹا رہا۔



”خیریت۔۔۔ خالہ ہینو! آپ اور ہمارے گھر۔۔۔“ اس کے ہاتھ میں خط پکڑے دیکھ کر بھنوس اچکاتے ہوئے کریدنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دل میں یہ خدشہ تھا کہ کہیں خالہ نے اسے چھت پر دیکھ تو نہیں لیا جو نانا جان سے اس کی شکایت لگانے آئی ہے۔

”میں میاں جی کو یہ خط دکھانے آئی ہوں۔“ خالہ کی بات پر اس کا جیسے سانس ہی تو رک گیا تھا۔

”وہی مجھے بتا سکتے ہیں کہ خط پر لکھی لکھائی آخر کس کی ہے؟ خالہ بڑے غصے میں لگ رہی تھی۔

”نانا جان بھلا کیسے بتائیں گے کہ اس کی لکھائی ہے۔“ اس نے سکون کا سانس لیا تھا کہ خالہ کا شک اس پر نہیں ہے اور اب وہ خط انہیں نانا جان کو دکھا۔

ساتھ چکر کا جالر میاں بی کو بتا دے گی۔ وہ اس کا نانا جان سے ڈرتا اور دینا جان جو گئی تھی اور وہ مرتا کیانہ کرتا بے صداق انہیں پیسے دینے پر مجبور تھا کیونکہ اس کے دیبلے پہلے وجود میں نانا جان کی مار کھانے کی ہمت نہیں تھی۔

مگر اب۔۔۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نہ گڈی کے ہاتھ خط بھیجے گا اور نہ ہی اسے کوئی پیسہ دے گا اس نے خود ہی گلابو تک خط پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اب بھی وہ ہاتھ میں خط لیے کب سے چھت پر کھڑا ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا سامنے ہی تو گلابو صحن میں بیٹھی بال کھولے جو میں نکال نکال کر مار رہی تھی اور اس کے قریب ہی خالہ ہینو (گلابو کی ماں) سلائی مٹین رکھے کچھ سلائی کرنے میں مصروف تھی۔ گلابو سے چھوٹی چار پائی پر ٹائٹلیں لٹکا کر بیٹھی انہیں جھولاتے ہوئے گنا چورہ دیتی تھی۔ اس سے دو چھوٹی بہنیں اسٹاپوں کھیلنے میں مصروف تھی اور دو بڑے بھائی کھانا پکانے سے بالن کاٹ رہے تھے گڈی اپنی فوج کو لیے مٹی کے کھلونے بنا رہی تھی۔ (یعنی چھوٹے بہن بھائی) مٹھو کو بچوں سے بھرے اس گھر کو دیکھ کر بے ساختہ اپنے اسکول کی یاد آئی تھی۔ اتنا رش تو اس کے اسکول میں بھی نہیں ہوتا تھا جتنا کہ گلابو کے گھر میں تھا۔

”پتا نہیں یہ خالہ ہینو کب گلابو کے پاس سے اٹھے گی۔“ اس نے خالہ کو سلائی میں مصروف دیکھ کر کوفت سے سوچا۔ وہ بے چینی سے اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا مگر وہ تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

گلابو کے بڑے بھائی بالن رکھ کر باہر چلے گئے تھے یقیناً ”گڈی بھی اپنی فوج سمیت گھر سے باہر چلی گئی تھی تب ہی اسے گھر اب قدرے بڑا اور پرسکون لگا تھا جیسے چھٹی ہونے کے بعد اسکول ہر طرح کے ہنگامے سے بے نیاز اور خاموش ہو جاتا ہے۔

”لگتا ہے مٹھو گڈی کو ہی پیسے دینے پڑیں گے۔“ وہ خالہ ہینو کو نہ اٹھتے دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے مایوس سا نظر آنے لگا تھا۔ جب اس کی خالہ اٹھ گئی بے ساختہ

سے باز رکھنا چاہتا تھا کہ کہیں نانا جان اس کی لکھائی نہ پہچان لیں۔

”نہ بھلا میاں جی کیسے نہیں لکھائی پہچانیں گے آنر وہ پانچویں تک پنڈے کے منڈوں کو پڑھاتے رہے ہیں۔“ وہ ملنے والی نہیں تھی۔

”ویسے مجھے پورا یقین ہے یہ حرکت نائیوں کے منڈے کی ہے۔ وہی ہے جو پورے پنڈ میں میری بیٹیوں پر بری نظر رکھتا ہے۔“ خالہ دانت پیستے ہوئے بڑی پر یقین تھی۔

”چھوڑیں نا خالہ! کسی نے یونہی مذاق میں آپ کے گھر خط پھینک دیا ہو گا ورنہ بھلا آپ کے گھر کوئی کسے چھیڑے گا۔“ وہ خالہ کو باز رکھنے کی کوشش میں یونہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر کندھے اٹھاتے ہوئے دھیرے سے ہنساتھا۔ اپنے تحت اس نے خالہ کے حق میں بات کی تھی کہ وہ خوش ہوگی، مگر وہ تو اس کی بات پر بھڑک اٹھی تھی۔

”کیوں؟ کوئی ہمارے گھر میں کسی کو کیوں نہیں چھیڑ سکتا آخر مطلب کیا ہے تیرا کہنے کا۔“ وہ کڑے تیروں سے اسے گھور رہی تھی۔ ”نہ میں پوچھتی ہوں میری بیٹیاں لولی ہیں یا پھر لنگڑی جنہیں کوئی چھیڑ نہیں سکتا۔ ارے! میری بیٹیاں لاکھوں میں ایک ہیں۔“

”لاکھوں میں ایک نہیں بلکہ لاکھوں کو ملا کر ایک بنتی ہے۔ جسامت میں۔“ مٹھو نے کان کھجاتے ہوئے سوچا تھا۔

”جہاں جاتی ہیں میری بیٹیاں لوگ پیروں میں بچھے جاتے ہیں۔“ خالہ تو اسے جھڑکتے ہوئے اپنی بیٹیوں کے مداحوں کا فخر سے بتا رہی تھی۔

”حیرت ہے خالہ! لوگوں کے پیروں تلے تو چٹائیاں پٹھنی ہوئی ہیں اور آپ کی بیٹیوں کے پیروں تلے لوگ نہ جاتے ہیں۔“ وہ بے حد حیران ہوا تھا۔

”اپنی بیٹیوں سے کہیں ذرا آہستہ آہستہ چلا کریں اے بے چارے میں ان کا وزن اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی ہوگی۔“ اس کا اشارہ خالہ کی صحت مند سی بیٹیوں کی طرف تھا اور وہ واقعی بچھے ہوئے لوگوں کا سن

کر بہت فکر مند ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ خالہ اسے اپنی بیٹیوں کو موٹا کہنے پر کھری کھری سناٹی نانا جان آگئے تھے۔

”ہینو! چھوڑ اس بے وقوف مٹھو کو تیرے میاں جی آگئے ہیں۔ دکھا انہیں کیا دکھانے آئی ہے۔“ بے بے رولی پکاتے ہوئے شاید ان کی گفتگو سن چکی تھی تب ہی اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

”یہ خط دیکھ کر مجھے بتائیے میاں جی کہ یہ لکھائی کس بندر کس ڈڈو کی ہے۔ مجھے خط بھیجے والے کا پتا چل جائے پھر دیکھیں گے میں اس کھوتے (گدھے) کا کیا حال کرتی ہوں۔“ خالہ ہینو سفید داڑھی اور سبز عمامے والے نفیس سے میاں جی کے سامنے خط کھول کر رکھتے ہوئے اپنے ارادوں کا بھی بتا رہی تھی۔

”خالہ! کسی کو غلط ناموں سے نہیں پکارتے۔ گناہ ہوتا ہے۔“ وہ خود کو بندر اور ڈڈو جیسے ناموں سے پکارتا دیکھ کر برداشت نہیں کر پایا تھا۔ نانا جان نے اسے گھورا تھا جواباً ”وہ مودب سا بنا سر جھکا گیا تھا۔“

”قلم کی بجائے کسی اور چیز کو خون میں ڈبو کر لکھا گیا ہے یہ جاننا مشکل ہے کہ یہ کس کی لکھائی ہے۔“ نانا جان نے بغور تحریر کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”ویسے تو میں تقریباً“ سارے پنڈ کے لڑکوں کی لکھائی پہچانتا ہوں مگر اتنی گندی لکھائی تو میرے خیال میں پنڈ کے کسی بھی لڑکے کی نہیں ہے۔ بابو نام کا لڑکا بھی پنڈ میں کوئی نہیں ہے۔“ ماسٹر جی نے اپنے ذہن میں تقریباً ”تمام ہی لڑکوں کا نام دہرایا تھا مگر نہ تو کسی کی لکھائی اتنی گندی تھی اور نہ ہی کسی کا نام بابو تھا۔ مٹھو نے بے ساختہ خدا کا شکر کیا تھا کہ آج اس نے پورے خط میں صرف بابو نام دہرایا تھا کہ گلابو خوش ہوگی کہ اسے اس کا لکھا ہوا نام کتنا پسند ہے۔“

”میاں جی خط کس سے لکھا ہوا ہے۔“ بے بے کسی خیال کے تحت پوچھ رہی تھی۔

”شاید کسی جانور کے خون سے لکھا گیا ہے۔“ نانا جان نے خط ناک کے قریب لے جا کر سونپھنے ہوئے کہا تھا۔



”ہمت کر لے بابو! انہیں ایسا نہ ہو کہ تو ہمت کرتا رہ جائے اور تیری ہیر کو کھیرے بیاہ کر لے جائیں۔“ وہ آنکھوں کو پھٹلاتے ہوئے منہ بنا گئی تھی۔ شاید اسے مٹھو کی کم ہمتی پسند نہیں آئی تھی۔

”ہاں ہاں! میں ضرور بے بے سے بات کروں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر گلابو، کسی مانی کے لال میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ مٹھو کی پسند کو بیاہنے آئے۔“ اس نے گلابو کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دی تھی کیونکہ اکثر ہی وہ خود کو یہ تسلی دیتا رہتا تھا کہ آج وہ بے بے سے اپنی شادی کی بات کرے گا مگر ہیرا رانا کی شکل دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے جاتی کہ نانا جان کیا سوچیں گا کہ مٹھو کو اپنے بیاہ کی اتنی ہی جلدی ہے پتا نہیں نانا جان کا احترام تھا یا ڈر کہ نانا جان کو پتا چل جانے کے خیال سے وہ بے بے سے بھی بات نہیں کیا تھا۔

”تو تو شہر میں بڑھا ہے نانا بابو! پھر تو تجھے انگریزی بہت اچھے سے آتی ہوگی۔ نی وی والوں کی طرح۔“ وہ چند لمحے اس کی بات پر میٹھی سی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد کسی خیال کے تحت آنکھوں میں معصومیت لیے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں! تجھے فر فر بولنی آتی ہے انگریزی۔“ وہ چٹکی بجاتے ہوئے ساری افسردگی بل بھر میں بھول کر سینہ شان سے تانتے ہوئے پر یقین تھا۔

”اچھا تو مجھے ذرا اس کی انگریزی بتا کہ۔ میں لاہور جانا چاہتی ہوں۔“ بہت سوچ کر اس نے اپنے تحت مٹھو کو بہت مشکل جملہ انگریزی بنانے کے لیے دیا تھا۔ شاید وہ یہ جانا چاہتی تھی کہ مٹھو کتنا ذہین ہے۔

”I go to lahore“ یہ ہے اس جملے کی انگریزی تم نے کیا مجھے تالاق سمجھا ہوا تھا۔“ کتنی دیر سوچ بچار اور لفظوں کو ذہن میں ترتیب دے کر ہونٹوں کو قدرے آگے اور پیچھے دھکیلتے ہوئے بول کر وہ کس قدر نخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”واقعی میرا بابو تو فر فر انگریزی بولتا ہے۔“ وہ اس کے منہ سے انگریزی کا ایک جملہ روانی سے سن کر امپریس ہوتے ہوئے آنکھوں میں ستائش لیے اسے

بے بے کو بے ساختہ مٹھو کے ہاتھ میں پکڑی خون والی بوتل یاد آئی تھی۔ انہوں نے موٹے عدسوں والی عینک کے پیچھے سے اسے دیکھا تھا اور لمحے میں سمجھ گئی تھی کہ یہ خط بھیجنے والی حرکت کس کی ہے۔

خالہ پنو مایوس سی پلٹ گئی تھی یہ کہتے ہوئے کہ وہ پتا کروالے گی کہ یہ حرکت کس کی ہے۔



”مٹھو! میں تیری ماں سے ملنے شہر جا رہی ہوں اگر تو نے اسے کوئی پیغام دینا ہے تو مجھے بتا دے۔“ صبح وہ روٹی کے بڑے بڑے نوالے توڑ کر منہ میں رکھ کر چپا کم اور نکل زیادہ رہا تھا جب بے بے نے اس کو بتایا تھا۔

”ماں سے کہنا کہ میں بالکل چنگا ہوں اور اس سے کہنا کہ کسی دن اگر مجھ سے مل جائے۔“ وہ سادہ سے انداز میں کہتے ہوئے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے مینے لگا تھا۔ بے بے نے اس کی سادگی پر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیلاتا اور برتن اٹھانے لگی تھی ساٹھ سال کی ہونے کے باوجود وہ توانا اور چست تھی ابھی تک وہ گھر کے گھر کے کام خود ہی کرتی تھی۔



”قسم سے بابو! تمہیں نہ دیکھوں تو مجھے چین نہیں آتا آج بھی اماں مامے کے گھر گئی ہوئی تھی تب ہی پانی بھرنے کے بہانے گھر سے نکلی ہوں کہ شاید تجھ سے ملاقات ہو جائے ویسے تو خط والے واقعے کے بعد اماں مجھے دروازے میں چاتی تک نہیں مارنے دیتی۔“

اسے گھرا اٹھا کر نہر کی طرف جاتا دیکھ کر وہ پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اور اب دونوں نہر کے کنارے لگی سبز گھاس پر بیٹھے تھے جب گلابو نے گھاس کو نوچتے ہوئے اداسی سے اپنے دل کا حال بتایا تھا۔

”مجھ سے بھی بھلا، تجھ سے دور کہاں رہا جاتا ہے گلابو! مگر پتا نہیں کیوں بے بے اور نانا جان سے تمہاری اور اپنی شادی کی بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔“ وہ اس کی اداس شکل دیکھ کر خود بھی اداسی سے بولا تھا۔

سٹرا کر دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر بڑی فخریہ مسکراہٹ تھی۔

”کچھ اور پوچھنا ہے تو بتا۔“

”اچھا تو پھر مجھے یہ بتا کہ اگر کڑی (لڑکی) کو لاہور جانا ہے تو اس جملے کو کیسے بولتے ہیں اور اگر منڈے کو جانا ہے تو پھر کیسے۔ اب میرے جیسی تین جماعتیں پاس کو تو تھپتھپانے لگنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔“

مٹھو نے تو یونہی جوش میں اسے مزید انگریزی جملے سنانے کی پیشکش کی تھی اور وہ واقعی فوراً اس سے مزید پوچھنے لگی تھی۔

اس کے پوچھنے پر مٹھو کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنا سر زور سے دیوار پر دے مارے کیونکہ گلابو کو مزید سوال پوچھنے کا آئیڈیا اسی ذہن نے تو دیا تھا مگر محبوب کو امپریس کرنے کے چکر میں وہ سوچ میں ڈوب گیا تھا اب جواب تو اسے دینا ہی تھا اسے کیسے کہہ دیتا کہ اس کے ماسٹر نے یہ بملہ اسے ایسے ہی پڑھایا تھا یہ تو اسے کبھی بھی ماسٹر نے نہیں بتایا تھا کہ لڑکے کے لیے یہ ٹینس بولا گیا ہے یا لڑکی کے لیے۔

”کڑی کے لیے چھوٹا آئی لگتا ہے اور اگر منڈے کو لاہور جانا ہو تو ٹوٹی والا بڑا آئی۔“ بالا خرا سے یہی سمجھ آیا تھا اور اس نے جھٹ اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔ بان جو گیا تھا کہ تین جماعتیں پاس گلابو کو کیا سمجھ آئے لی کہ وہ صحیح بول رہا ہے یا غلط۔

”میں اپنے سمجھ دار مٹھو کے صدقے جاؤں۔“ وہ ایں کی ذہانت کی قائل ہوتے اس کی بلا میں لینے لگی تھی جس نے اس کے مشکل جملوں کی انگریزی بڑی روانی سے اسے بتا بھی دی تھی اور سمجھا بھی دی تھی۔ (اس کے ذاتی خیال میں)۔

”اور کیا یونہی تو ماسٹر مجھے ہر کلاس میں دس سال نہیں اٹاتے تھے۔ چودہ سال میں سات جماعتیں پاس کرنا ہر ای کے بس کی بات تھوڑی ہے۔“

وہ فخر اور جوشیے انداز میں اسے متاثر ہوتا دیکھ کر ان اکڑائے ہوئے تھا اور وہ پانی میں ہاتھ ڈالے بڑی تیز اور محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔



”مٹھو پتر! میں اور تیرے نانا جان تیری خالہ ہینو کے گھر جا رہے ہیں۔ دعا کرنا خوش خبری لے کر ہی واپس آئیں۔“ وہ منڈی سے لائی گئی پھلوں کی پیٹیوں سے پھل نکال کر صاف کر کے ریڑھی پر لگا رہا تھا جب بے بے نیا ٹکڑا ویلوٹ کا سوٹ پہنے اس کے قریب آ کر خوشی خوشی اسے بتانے لگی تھی۔ وہ جب سے اس کے امی ابے سے مل کر شہر سے آئی تھی ایسے ہی خوش سی تھی۔

”خالہ ہینو! پھر امید سے ہے۔“ وہ ثانی کی خوشی کی یہی وجہ سمجھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گلابو کے گیارہ بہن بھائی گھومے تھے اور بے بے کا اسے بارہویں متوقع سالے، سالی کے لیے دعا کرنے کا کہنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

”معاف کرنا بے بے! میں اب خالہ ہینو کے لیے کوئی دعا نہیں کر سکتا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر دو ٹوک انداز سے کہا تھا۔

”اب اگر کوئی بچہ بھولے سے بھی جنم لے کر خالہ ہینو کے گھر آگیا تو میں ہرگز خالہ ہینو کو معاف نہیں کروں گا۔“ وہ بھنویں اچکاتے ہوئے قدرے خفا اور غصے سے بولا تھا۔

بے بے جو اس کی حیرت اور غصے پر حیران ہو رہی تھی۔ اس کی بات سمجھ کر اس کے تپنے پر کتنی دیر ہستے رہنے کے بعد گویا ہوئی تھی۔

”کھلمے پتر! جیسا تو سمجھ رہا ہے وہی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو تیرے اور گلابو کے رشتے کی بات کی ہونے کی خوش خبری کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

”اس دن تیری ماں سے یہی پوچھنے تو شہر گئی تھی کہ اگر اسے گلابو پسند ہے تو تیرے لیے اس کا رشتہ مانگوں، مگر تیرے امی ابے نے تو تیری ساری ذمہ داری مجھ پر ہی ڈال دی ہے کہ میں اور میاں جی تمہارے لیے جو بہتر سمجھیں وہی کریں۔“ وہ خوشی خوشی اسے بتا رہی تھی



سیدھے شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔
شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی دونوں گھرانوں میں
شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ مٹھو کے بہن
بھائی اور امی، ابا بھی شہر سے آگئے تھے اس کی بہنیں روز
رات کو رات رکھ کر بجاتے ہوئے اسے چھیڑتیں اور
وہ مشرقی لڑکیوں کی طرح شرمایا سا مسکراتا رہتا۔

بالا خیرات والا دن بھی آہی گیا تھا۔ مٹھو میاں
گولڈن شیروانی اور گلے میں نوٹوں والے ہار ڈالے
خوب سج رہے تھے۔ اس کی اماں نے کتنی ہی دیر بلائیں
لے کر اس کی نظر اتاری تھی پیسے اتار کر کام والی ماسی کو
دیے تھے پھر کہیں جا کر مٹھو ڈھول کی تھاپ پر ناچتے یار
دوستوں کے ساتھ مسجد میں سلام کرنے کے بعد گلابو
کے ہاں گیا تھا۔ جہاں رنگ برنگی تیلیوں کی طرح
مختلف رنگوں میں بنی لڑکیوں نے پھولوں کی پتیاں
نچھاور کر کے ان کا استقبال کیا تھا اور مٹھو میاں گردن
اکڑائے بڑی شان سے چلتے ہوئے ٹینٹ کے بیچ رکھے
گئے صوفے پر بیٹھ گئے تھے بمعہ یاروں کی بارات کے
ساتھ۔

”دولہا بھائی دس کانوٹ تو دینا۔ ذرا قلفی کھانی ہے۔“
گڈی نے اس کے پیسوں والے ہار کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بڑے پیار سے پیسے مانگے تھے شاید
وہ جان گئی تھی کہ اب رعب سے پیسے نہیں ملیں گے
اور وہ جو کہتا تھا کہ اب وہ کبھی بھی گڈی کو ایک روپیہ
تک نہیں دے گا۔ اس نے مسکراتے ہوئے بڑے
شاہانہ انداز میں دس کانوٹ نکال کر اسے تھما دیا تھا۔
شاید خوشی انسان کو ایسا ہی سخی اور خیال کرنے والا
بنادیتی ہے۔

”دولہا بھائی ذرا پانچ روپے تو دینا وہ آلو چنے لینے
ہیں۔“ گڈی بھی اپنے نام کی ایک تھی وہ کتنی ہی پیار
اسے کچھ نہ کچھ کھانے کا کہتے ہوئے پیسے لے گئی تھی
اور اب پھر اس کے سامنے کھڑی پیسے مانگ رہی تھی۔
”چلو بھائی! نہیں ہیں۔“ پیسے۔“ بالا خروہ اس
کے پیسے مانگنے پر تنگ آ کر دھیرے سے ڈپٹے ہوئے بولا
تھا۔ خیال جو تھا کہ دولہا بہت اونچا نہیں بولا کرتے۔

اور وہ دل کی مرادوں اچانک بر آنے پر خوش و حیران سا
لکڑا ایک ٹک بے بے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تو بے بے سے
گلابو کے متعلق بات کرنے کا سوچ رہا تھا اور بے بے
نے کیسے خود ہی گلابو سے اس کے رشتے کی بات کر کے
اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ وہ اس پر جتنا بھی
خوش ہوتا تھا۔

”بے بے! کیا تجھے پتا تھا کہ تیرا مٹھو، گلابو کو پسند
کرتا ہے۔“ وہ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت لیے
پوچھ رہا تھا۔

”مجھے تو اس دن تم پر شک پڑ گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے
جب میں نے تیرے پاس وہ خون والی بوتل دیکھی تھی
اور تیری خالہ پینو کے ہاتھ میں وہ خون سے لکھی گئی
چٹھی دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کام تیرا ہی ہے۔ تب
ہی میں نے سوچا کہ اپنے مٹھو کی اس کی پسند سے شادی
ضرور کرواؤں گی جب میں نے میاں جی سے بات کی تو
وہ بھی خوش ہوئے کہ چلو اس بہانے ہی شاید مٹھو کو
کچھ عقل آجائے۔“ بے بے تفصیل سے اسے بتا
رہا تھا اور وہ نانا جان کی بات کا برا منائے بغیر اس بات
پر خوش ہوا تھا کہ چلو نانا جان مان تو گئے۔

”تو بہت چٹنی (اچھی) ہے میری سوہنی بے بے!“
وہ بچوں کی سی معصومیت اور خوشی سے جھومتا ہوا بے
بے سے چمٹ ہی تو گیا تھا۔ بن مانے اسے اس کی محبت
مل رہی تھی وہ اس پر جتنا بھی شکر کرتا تھا۔

بے بے اور میاں جی گلابو کا رشتہ مانگنے گئے تھے اور
گلابو کے امی ابا نے سوچنے کا ٹائم بھی نہیں لیا تھا اور
یہ کہتے ہوئے فوراً ”ہاں کر دی تھی کہ میاں جیسے
شریف اور نیک بندے کے سائے تلے ان کی بیٹی
رہے اس سے بڑھ کر انہیں کیا چاہیے۔ ویسے بھی
انہیں سیدھا سادہ کماؤ مٹھو بہت مناسب لگا تھا اپنی بے
وقوف سی گلابو کے لیے۔

میاں جی نے مٹھنی کی بجائے شادی کا مشورہ دیا تھا
جسے فوراً ”گلابو کے ابا نے منظور کر لیا تھا کہ وہ خود بھی
مٹھنی کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے
دونوں گھرانوں کی رضامندی کے تحت مٹھنی کی بجائے

گڈی نے چند لمحے اسے دیکھا تھا اور پھر واپس چلی گئی۔
باراتیوں کو کھانا کھلانے کے بعد مٹھو میاں کو گھر
لے اندر سلامی دینے کے لیے لے جایا گیا تھا۔

”جی جاجی! پیسے نا۔“ سلامیوں کے بعد دودھ پلائی کی
رسم ہو رہی تھی جب گلابو کی چھوٹی بہن، زرق برق
پیروں میں اپنے بھاری جسم کو دائیں بائیں جھولاتے
ہوئے سیلیوں کے سنگ دودھ کا سجا سجا گلاس لے
کر چلی آئی تھی اور اب آنکھوں میں شوخی لیے خود کو
ماحوری سمجھتے ہوئے ایک ادا سے بولی تھی۔

مٹھو نہ جانے کیوں۔ منہ پر رومال رکھے شر باسا گیا
تمنا۔

”آپ اپنے ہاتھوں سے پلائیں گی تو ضرور پیسے
لے۔“ اس کے دوستوں نے یہ جاننے کے لیے کہ
دودھ پلائی رسم میں کڑیوں کو کیسے لاجواب کرنا ہے۔
یوٹی سو سے قریب پاکستانی اور انڈین فلمیں دیکھی
تھیں اور اب بڑی شان سے اس کی دائیں بائیں بیٹھے
بادوں میں ایک ادا سے ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کو ہیرو
ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

اب بھی گلابو کی بہن کے کہنے پر مٹھو کا ایک
”ست کالر کو جھٹکتے ہوئے مسکرایا تھا۔“

”ہم اگر اپنے ہاتھوں سے کچھ پلائیں گی تو وہ زہر
نہ لے گا۔“ گلابو کی ایک بانس کی طرح لمبی سہیلی نے دوپٹا
سوالتے ہوئے کن آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے
کہا تھا۔

”ارے یہ وہی فلم نہیں ہے۔“ مٹھو نے کسی فلم کا
نام لیتے ہوئے اپنے برابر بیٹھے اپنے جیسے سوکھے سڑے
ٹاف سے پوچھا تھا۔ وہ پرسوں رات دیکھی جانے والی
فلم لوریو انز ہو ما دیکھ کر بے حد حیران ہوا تھا۔

”لگ تو اسی فلم کے ڈانٹلاگ رہے ہیں۔“
ٹاف اپنے بچے نما ہاتھ پر گال رکھے گلابو کی کسی
بلی کی بے خود سا دیکھتے ہوئے کسی اور ہی جہان میں
نہا ہوا تھا۔

”آپ کے ہاتھ سے زہر پینا۔ ہمارے لیے کسی
امرت سے کم نہیں ہوگا۔“ مٹھو کے ایک اور یار نے

دل کے مقام پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھوں میں اشتیاق
لیے ان رنگ برنگی تیلیوں کو دیکھا۔

اس کے یوں کہنے وہ سب کی سب حیران سی ایک
دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں۔

”اے بھلا یہ کون سی فلم کا ڈانٹلاگ تھا۔“ گلابو
کی سہیلی نے ساتھ والی لڑکی کے کان میں سرگوشی کی
تھی۔ جواباً اس نے فلم کا نام اور اس کا اگلا سین بھی بتا
دیا تھا۔

”لگتا ہے کمنٹوس نے بھی وہی فلم دیکھ رکھی ہے جو
ہم نے دیکھی ہے۔“ گلابو کی بہن کو ان کے پہلے
ڈانٹلاگ پر شک اور حیرت اور دوسرے پر یقین ہی تو
ہو گیا تھا اس سے پہلے کہ وہ دانت پیستے ہوئے انہیں
کھری کھری سناتی۔ ماحول دھڑام دھڑام کی آوازوں
سے گونج اٹھا تھا۔

”ہائے اللہ! میں مر گئی۔ یا اللہ رحمہ۔“ لمحے میں ہی
سارے گھر کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ عجیب افراتفری
کا عالم تھا۔ سب مسمان ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے
ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

”ارے! ہم نے تو پٹانے پھوڑے تھے اور آپ
سب ڈر گئے۔“ گڈی اور بلو ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے
ہنس رہے تھے۔

”شکر ہے اللہ! میں سمجھی شریکوں نے میری گلابو کی
شادی میں ہم مار دیا ہے۔“ خالہ ہینو سینے پر ہاتھ رکھے
لبے لمبے سانس لیتی ہوئی دم سادھے مٹھو کی اماں اور
بے بے کو ایک دوسرے سے چٹنے ہوئے دیکھ کر بولی
تھیں۔

ہیروئن بنی لڑکیاں ایک دوسرے پر گری ہوئی
تھیں اور اب انھنے کی کوشش میں تھیں اور خود کو ہیرو
سمجھنے والے باراتی صوفوں اور چارپائیوں کے پیچھے سے
برآمد ہو رہے تھے۔ پٹاخوں سے کہیں زیادہ ڈر تو انہیں
بڑی بوڑھیوں کے چٹنے سے لگا تھا۔

”ہائے اللہ! میرا مٹھو نظر نہیں آ رہا! کہیں پٹاخوں
کے ساتھ ہی تو نہیں اڑ گیا۔“ بے بے نے ایک نظر
مجموعے پر ڈالی تھی اور دلے میاں کو کہیں نہ پا کر



”گڈی یا بلو! شادی کے بعد میرے گھر کے آس پاس بھی بھٹکے تو ان کی ٹانگیں نہ توڑ دیں تو میرا نام بھی مٹھو نہیں۔“ اس نے بڑے کڑے تیوروں سے ہنستے مسکراتے گڈی اور بلو کو دیکھ کر سوچا تھا۔

رخصتی کا شور اٹھا تھا اور وہ جو قدرے ناراض اور سہا ہو لیٹھا تھا کہ نہ جانے اب اس گھر میں اس کے ساتھ کیا ہو جائے وہ گلابو کو لہنگا کرنی میں ملبوس دلہن بنے، سیلیوں کے سنگ آتا دیکھ کر سارا ڈر و کوفت بھول کر بے خود سا ہوتے ہوئے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ لہنگے کرتی میں بے شک اس کا وزن دگنا لگ رہا تھا، مگر وہ لگ کمال رہی تھی اس نے گلابو کو کن انکھوں سے دیکھ کر سوچا تھا۔

”اے، اے دولہے کو دیکھو، کیسے اپنی گلابو پر فدا ہو رہا ہے۔“ کسی نے اسے یوں بے خود سا گلابو کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تھا اور مٹھو میاں جلدی سے دھیمسا مسکراتے ہوئے نظروں کو جھکا گئے تھے۔ دلہن کو دولہا کے ساتھ کھڑا کر کے چند تصویر کھینچی گئی تھیں اور پھر مٹھو میاں اپنی دلہن کے سنگ بڑے مضبوط اور سچ سچ کر قدم اٹھاتے ہوئے اسے رخصت کروا کر جانے لگے تھے کہ۔

”ہائے ابا! تیری گلابو گئی!“ گلابو کی اس دردناک آواز پر دولہا میاں کا دل ڈوب کر ابھرا تھا وہ بے حد پریشان سا گھبرا کر پلٹتا تھا جہاں گلابو مسمانوں کے ہجوم کے بیچ نم آنکھوں والے اپنے ابا کے گلے لگے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ دل گرفتگی اور اداسی سے گلابو کو روتا دیکھ کر بھی اسے یقین تھا کہ گلابو بی بی کسی فلم کے سین کو دہرا رہی ہے۔

گلابو کو یوں روتا دیکھ کر باراتیوں کی آنکھیں بھی بھگ رہی تھیں اور اس کی بہنیں اور بھائی تو گلابو کے گلے لگ کر ہلک کر رو رہے تھے جیسے وہ جنگ کرنے جا رہی ہو جہاں سے اس کے لوٹ کر آنے کی امید نہ ہو۔

گلابو اور اس کے گھر والوں کو روتا دیکھ کر خود نرم دل مٹھو کا دل بھی دھاڑیں مار کر رونے کو چاہنے لگا تھا، مگر

حواس باختہ سی منہ پر کپڑا رکھ کر بھوں بھوں کر کے رونے لگی تھی۔

”ہائے! میرا کرم دین کہاں چلا گیا؟“ بے بے کی ہاں میں ہاں ملانے والی مٹھو کی ماں نے تو اس کی گمشدگی پر باقاعدہ اپنا سینہ پیٹنا شروع کر دیا تھا سب لوگ دولہا کی اچانک گمشدگی پر گھبرا کر اسے ڈھونڈنے کے لیے اٹھے تھے۔

”میں یہاں ہوں اماں!“ بے بے کے رونے اور ماں کے سینہ پیٹنے پر مٹھو میاں کی گھبرائی سی آواز سنائی دی تھی۔

”کہاں؟“ بے بے کے ساتھ ساتھ اس کی اماں نے بھی گردن گھما کر متلاشی نظروں سے اپنے دائیں بائیں دیکھا تھا، مگر وہ ہوتا تو دکھائی دیتا۔

”چارپائی کے نیچے بے بے!“ مٹھو میاں حواس باختہ ساروں کی صورتوں سے بے بے بولے۔

”بے بے صدقے، اپنے پتر پر۔“ بے بے اسے پورا نہ لٹکائے دیکھ کر تڑپ کر آگے بڑھی تھی۔ ”وے! کبھی کبھار کیوں ہو۔ میرے پتر کو نکالو۔“

بے بے کے ساتھ ساتھ اس کی اماں نے بھی باراتیوں کے دو دو ہاتھ مار دیے تھے۔

باراتی اپنے کندھوں پر پڑنے والے دھموکوں کو سہلاتے ہوئے اگلے ہی لمحے مٹھو میاں کو کندھے سے گھسیٹ کر باہر نکال رہے تھے جو لمبے لمبے سانس لیتا ڈرا سہا سا دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ منہ ابھی بھی چڑیا کے بوٹ (بچے) کی طرح کھلا اور بٹن جیسی چھوٹی آنکھوں کے سامنے ابھی بھی اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ پٹانے گڈی اور بلو نے صرف اسے ڈرانے کے لیے پھوڑے تھے جو اس نے انہیں پیسے نہیں دیے تھے۔ مٹھو میاں ان شیطان بچوں کے شر سے محفوظ رہ کر خیر و عافیت سے گھر واپس جانے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں اتنا خوار اور حواس باختہ نہیں ہوا تھا جتنا اپنی شادی کے دن وہ گلابو کے بہن بھائیوں کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔

نے کے زعم میں وہ خود کو مضبوط اور بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش میں گردن اکڑائے کھڑا تھا۔

بیتے تیسے کر کے آخر گلابو کی رخصتی ہو ہی گئی تھی۔ مٹھو کا چھوٹا بھائی رکشا کو پھول پینوس سے سجائے اور دروازے پر دو لہا اور دلہن کا منتظر کھڑا تھا (جی ہاں! لہا میاں! دلہن کو رکشا میں لینے آئے تھے)

دلہن کا ساتھ والا گھر ہونے کی وجہ سے انہوں نے زیادہ پیسے گاڑی پر خرچ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا وہ تو راکشا کے حق میں بھی نہیں تھے وہ تو مٹھو کے لئے بھائی کو دو دلہن کو پیدل گھر میں لانا مناسب نہیں لگتا تھا تب ہی وہ کرائے پر رکشا تار کر کے لے آیا تھا۔

مٹھو میاں بڑی شان سے دلہن کو رکشا میں بٹھا کر اپنی والی بڑی اور لمبی گلی سے چکر لگا کر گھر لے ہی آئے تھے اور اس کے بہن بھائیوں کے جنجال پورے کے چپ رہ جانے پر بے ساختہ اس نے خدا کا شکر ادا کیا

”کرم دیں! میری بات سن۔“ نانا جان نے نائی کے ہاتھ ولیمے کی تیاری کے لیے دیگوں کا حساب کتاب لکاتے ہوئے اپنے دوستوں کے بیچ بے زار سی شکل بنا کر بیٹھے مٹھو کو آواز دے کر بلایا

”جی نانا جان!“ وہ شیر والی میں ملبوس نانا کے سامنے ”ب بنا کھڑا تھا۔“

”تو اپنے کمرے میں جا تیری دوہٹی تیرا انتظار کر رہی ہو۔“ دوستوں کے ساتھ تو بندہ ہمیشہ ہی بیٹھا رہتا ہے، اس سرف تم پر تمہاری دوہٹی کا حق ہے۔“ میاں نے بڑے سجاوے سے اسے سمجھایا تھا وہ نانا جان کے لئے شراب سا گیا تھا۔

”اپنی بیوی کو عزت اور بھروسہ ضرور دینا کرم دیں! میں اپنی بیوی کو عزت دیتا ہے تو جواباً عورت کی عزت دینی ہو جاتی ہے اور بھروسہ ہو تو کبھی میاں بیوی اس لہو کی رنجش جگہ نہیں بنا سکتی۔“ ہمیشہ اس کے نہ سننے پر اس سے نالاں رہنے والے نانا جان آج کیسے تڑپا اور دوستانہ انداز سے اسے سمجھا رہے تھے۔

”میں ایسا ہی کروں گا نانا جان!“ اس نے دل کی

گھڑائیوں سے نانا جان سے کہا تھا اور ان کے جانے کا کہنے پر سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف برہہ گیا تھا۔

”مٹھو بات تو سن۔“ اس کے دوستوں نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی مگر وہ ان سنی کرتا ہوا اندرونی حصے کی طرف برہہ گیا۔ پاگل تھا جو اپنی نئی نویلی دلہن کی میٹھی پیار بھری باتیں چھوڑ کر اپنے دوستوں کی رہائی کی پھسکی باتیں سنتا جو اسے کب سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اپنی بیوی کو سر پر نہ چڑھا لینا اس سے ذرا رعب سے بات کرنا۔ میاں جی شاید اس کے دوستوں کی باتیں سن چکے تھے تب ہی انہوں نے اسے اپنے پاس بلا کر بڑے پیار و محبت سے سمجھایا تھا۔

”مٹھو بھیا! ہمارا نیک؟“ وہ صحن میں بے ڈھنگے پن سے آڑے ترچھے لیٹے مہمانوں سے نظر بچا کر اپنے نئے گلابو کے جینز سے آراستہ ڈیکور شدہ کمرے میں اس کا انتظار کرتی اپنی دلہن کے پاس جانے کی کوشش میں تھا جب اس کی چار بہنیں سات آٹھ کزنز کے ساتھ دروازے کے آگے اس کے سامنے ننگ کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑی مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھیں۔ مٹھو میاں ننگ کے مطالبے پر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔

”کیسا نیک، کوئی پیسہ نہیں ہے میرے پاس تم لوگوں کو دینے کے لیے۔“ سارا دن وہ ننگ کے نام پر اتنے پیسے لٹا چکا تھا کہ اب وہ اپنی بہنوں سے صاف بیچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔

”وہی ننگ جو دولہے اپنی دلہن کے کمرے میں جانے سے پہلے اپنی بہنوں کو دیتے ہیں۔“ اس کی بڑی بہن نے بھنویں اچکاتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

”اگر آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو تھیک ہے پھر جب پیسے ہوں گے تب ہی ہم آپ کو آپ کی دلہن کے پہلو میں جانے کی اجازت دیں گے۔“ اس کی کزن نے گڈی کے انداز میں کہتے ہوئے دروازے کے سامنے اپنے بازو پھیلا دیے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ اندر پیسے دیے بغیر کسی طور نہیں جاسکتا۔



مان سے اس سے درخواست کر رہی تھی۔ آج پھر
مٹھو میاں کو لگا تھا کہ یہ کوئی فلمی سین کی رہے
نہیں ہو رہی بلکہ آج گلابو اپنے اصلی اور حقیقی
میں اس سے بات کر رہی تھی اسے گلابو کا یہ رنگ
اچھا لگا تھا۔ ”مگر میں۔۔“ وہ کچھ کہنے لگا تھا۔
”آپ میرے دل میں رہیں گے۔ بڑی شان
مان کے ساتھ۔ وہاں سے آپ کو کوئی نہیں ہٹا۔
میرے دل پر صرف آپ کا حق ہے۔“ اس
شرما کر۔۔ کہنے پر مٹھو میاں بے خود سا ہوتا ہوا
اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اس محبت کے مان اور
سے وہ مٹھو جیسے سادہ انسان سے جان بھی مانگتی
انکار نہیں کرتا۔

”دلوں میں گنجائش ہونی چاہیے جگہ خود بہ خود
جاتی ہے۔ ویسے بھی تیرے بہن بھائی کیا میرے
بھائیوں سے الگ ہیں جب ان کا جی چاہے وہ تم
ملنے آسکتے ہیں۔“ وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں
لیتے ہوئے دھیرے اور دیر سے ہر رنجش بھ
(جو گڈی اور بلو کے ساتھ تھی) پر خلوص لہجے سے
رہا تھا۔

گلابو نے بہت محبت اور ممنون نظروں سے
دیکھا تھا جو اپنے دل کے ارمان دل میں چھپائے
اور بلو کے جانے کے انتظار میں بیٹھا ان کے
کارٹون دیکھ رہا تھا۔

”ایسی سہاگ رات شاید ہی اس روئے زمین
کسی کی ہوئی ہوگی کہ دولہا میاں کارٹون دیکھ کر
بہلا رہے ہوں اور دلہن اپنے ننھے منے بھائیوں
رہی ہوں“ مٹھو میاں نے سادگی سے محبت
نظروں سے گلابو کو بھائیوں کو تھپکی دے کر
ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔

اس کی بات پر گلابو شرما کر رخ موڑ گئی تھی اور
میاں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے نظریں
اسکرین پر جمادی نیں۔ اس یقین پر کہ گلابو جیسی
کرنے والی لڑکی کے ساتھ زندگی بہت خوشی
امنگوں بھری گزرے گی۔

”یہی ہے میرے پاس آپس میں بانٹ لینا۔“ مٹھو
نے ان کا اٹل انداز دیکھ کر جیب سے چند سو سو کے
نوٹ نکال کر انہیں تھما دیے۔

مٹھو اپنے بالوں کو ہاتھ سے سنوار کر چند لمٹیں ماتھے
پر رکھتے ہوئے اپنے کالر کو جھٹک کر سیدھا کرتے
ہوئے دل میں ہزاروں ارمان اور آنکھوں میں محبت
کے جگنو سجائے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

”یا اللہ! میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔“ وہ
دروازے کی کنڈی لگا کر جیسے ہی پلٹا اسے اپنا سر چکراتا
ہوا محسوس ہوا اس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلاتے
ہوئے اپنے سچے سنو رے کمرے پر نظر دوڑائی۔

”کمرہ تو میرا ہی ہے پر یہ سب یہاں کیا کر رہے
ہیں؟“ اس نے الجھن سے سوچتے ہوئے بیڈ پر دلہن
بنی بیٹی گلابو پر۔ اور اس کی دا میں پائیں دو سے تین
سال کی عمر کے ننھے ننھے منے گول گپے جیسے پھولے
پھولے بھائیوں نظر آئی جو منہ میں چوسنی دبائے بڑے
مزے سے سو رہے تھے۔

گڈی اور بلو صوفوں پر بیٹھے جینز میں آنے والے
ٹی وی پر بڑے آرام اور انہماک سے کارٹون دیکھ رہے
تھے۔ مٹھو کو کمرے میں دیکھ کر انہوں نے بڑی اپنائیت
اور محبت سے مسکرا کر اسے ویلکم کیا اور اس کی جواب
میں ملنے والی گھوری کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ
ٹی وی پر نظر جمالی۔

گلابو! یہ فوج یہاں کیسے؟“ وہ بہت الجھا اور حیران
تھا اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ یہ حقیقت ہے یا
خواب۔۔

”کرم دین! میرے بھائی اور میری بہنیں مجھ سے
بہت محبت کرتے ہیں اگر وقت بے وقت مجھ سے ملنے
آجائیں تو تم برا نہیں منانا اور یہ چھوٹے تو ہمیشہ میرے
ساتھ ہی سوتے تھے۔ اماں سے بھی زیادہ پیار مجھ سے
کرتے ہیں۔ ابھی بھی رو کر ضد کر کے میرے پاس
سونے آتے ہیں مگر تم فکر نہیں کرو۔ گڈی اور بلو
ٹی وی دیکھ کر جاتے ہوئے انہیں لے جائیں گے۔“

گلابو آنکھیں مٹکاتے ہوئے کسی قدر اپنائیت اور